بانو قدسیہ کے افسانوں میں عصری آگہی

ساجدہ کنول [1]م ڈاکٹر سعدیہ طاہر **

Abstract:

"Literature is the best imitation of any society. The reflection of an epoch of any nation can be seen in its literature because it entirely covers the society. Not only does literature demonstrates the moral values but it also identifies the social evils. It also highlights the cause and cure of these evils so that the society may ament itself. Receiving an impact from the society, literature points it social, moral, political and economic effects on it as well. Bano Qudsia is a prominent name of Urdu fiction. She wrote many short stories, novels and dramas. Bano Qudsia's short stories are replete with wordly variegation. In her short stories she highlights different dimensions of contemporary era in effective and touching way. Her short stories demonstrate her deep interest and observation of issues of present society. This article attempts to highlight different aspects of contemporary awareness in Bano Qudsia's short stories."

Key words: prominent, short stories, variegation, dimensions, contemporary, demonstrate.

بانو قدسیہ اردو افسانہ نگاری کا ایک معتبر نام ہے ۔ انھوں نے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز قیام پاکستان کے بعدکیا۔ تخلیقی کاوشوں کی ابتدا تو افسانہ نگاری سے کی ،بعد ازاں نثرکی دیگر اصناف میں بھی نمایاں خدمات سر انجام دیں ۔ ان کے افسانوں کی دنیا متنوع موضوعات اور ہیت و تکنیک کے تجربات کی بوقلمونی سے عبارت ہے ۔ بانو قدسیہ ایک زیرک ادیبہ ہیں ۔ جن کے افسانے ان کی دقیق نظر ،عمیق مشاہدے ,ادق تجزیے ،وسیع مطالعہ اور قعر فہم و ادراک کے عکاس ہیں ۔

بانو قدسیہ کو انسانیت سے گہری ہمدردی تھی ۔ وہ لوگوں کی فلاح و بہبود کی آرزومندتھیں ۔ اس لیے انھوں نے اپنے افسانوں کا تارو پود زمینی سطح پر رو نما ہو نے والے حقیقی واقعات کی قاشوں سے تیار کیا ۔ ان کے افسانے عصر حاضر کے انسان کی داخلی و خارجی وارداتوں سے لبریز ہیں ۔ انھوں نے سیاسی بکھیڑوں ،سماجی شناعتوں، معاشی مسائل ،جنسی شقاوت ،جذباتی و نفسیاتی نا آسو دگی، روحانی عقدہوں اور ازدواجی مسائل کی گتھیوں کو فنی چابکدستی سے اپنے افسانوں میں سمویا ۔ ان کے افسانوں میں طبقہ اشراف کے چو نچلے اور لا ا بالی پن بھی ہے اور زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے محروم تڑپتا سسکتا ،لا چار طبقہ بھی ،گزشتہ مضبوط اقدارو روایات بھی ہیں اور مو جودہ عہد کی کھو کھلی قدریں بھی ،دیہاتیوں کی سادہ لو حی ،پیار و محبت اور خلوص نیت بھی ہے اور شہریوں کی جدت پسندی اور مکارانہ سوچ بھی ۔ ڈاکٹرشمیم روشن آرا ان کی افسانہ نگاری کے متعلق رقمطراز ہیں:

> ''بانو اپنے اندر ایک درد مند دل رکھتی ہیں ،جس کی وجہ سے وہ ہر شخص کے اندر جھانک کر دیکھتی ہیں اور پھر اس کو صفحہ قرطاس پر اتار دیتی ہیں ۔ جب قاری اس تحریر کو پڑھتا ہے تو محسوس کرتا ہے کہ یہ جو کچھ لکھا گیا ہے یہ اس کے ساتھ یا اس کے ارد

---

[1] پی ایچ ڈی اردوسکالر،وفاقی اردو جامعہ،اسلام آباد

** اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اردو ،وفاقی اردو یونیورسٹی،اسلام آباد

گرد کے انسانوں کے ساتھ بیت رہا ہے۔''(۱)

بانو قدسیہ نے اپنے افسانوں میں معاشرے کی من و عن عکاسی کی ۔ وہ معاشرے کے مشاہدے اور تجزیے کے لیے دل و دماغ کی آنکھیں کھلی رکھتیں اور اپنے تجربات و مشاہدات اور تجزیے کو کہانی کی صورت دے دیتیں ۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں مختلف پیشوں سے وابستہ لو گوں مثلاً ڈاکٹرز ،مذہبی اسکالرز،اساتذہ ،پولیس حکام اس کے علاوہ دیگر افسران کی زندگیوں کاژرف نگاہی سے مشاہدہ کیا اور واضح کیا کہ بظاہر فرائض کی ادائی کے وقت ان کا اصل مدعا کیا ہو تا ہے ۔ پیشہ ور لوگوں کی زندگی کا نسب العین لو گوں کی فلاح و بہبود ہونا چا ہیے لیکن بعض اوقات وہ اپنے اصول و قوانین اور نظم و ضبط کو انسانیت کی خدمت پر ترجیح دیتے ہیں ۔ ''کج کلاہ ''افسانے میں بانو قدسیہ ڈاکٹر کے کردار پر رو شنی ڈالتی ہیں ۔ جس میں ایک 'اجنبی ڈاکٹر کے کلینک پر ایمر جنسی کی صورت میں ڈاکٹر کو لینے آ تا ہے ۔ وہ اپنی باری کا انتظار کیے بغیر اس کے آفس میں گھس جاتا اور ڈاکٹر کو ساتھ جانے کا کہتا ہے ۔ ڈاکٹر فوراً ً ساتھ جانے سے انکار کر دیتا ہے جس پر اجنبی کہتاہے :

''یہ چو تھا کلینک ہے جس سے مجھے خیر نہیں پڑی ۔ کیا شہر کا ہر ڈاکٹر پرو فیشنل لٹیرا ہے ۔ پیسہ کمانا اور دھکے دینا ہی آپ کا پروفیشن رہ گیا ہے اس آواز سے ڈاکٹر کا رد عمل تیار ہوا ،وہ بر فیلی آواز میں بولا ـــــمیں نے اپنی کلینک کا نام بڑی مشکل اور ڈسپلن سے بنایا ہے ۔ ابھی نکل جاؤ ورنہ مجھے نکالنا آتا ہے ۔ ''(۲)

یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ غالب اور ترقی یافتہ اقوام دوسروں پر بہت جلد اثر انداز ہوتی ہیں ۔ وہ ترقی پذیر ممالک کے رہن سہن ،رسم و رواج اور ان کی فکر کے زاویوں کو شدت سے متاثر کرتی ہیں ۔ ترقی پذیر ممالک میں عام طو ر پر لوگ یہ جاننے کی کم ہی کوشش کرتے ہیں کہ ترقی یافتہ ممالک نے ترقی کیوں کر حاصل کی اور اس کے پس پشت کون کون سے عوامل و عناصر کارفرما ہیں ۔ وہ ان کلیات کی پیروی کرنے کی بجائے ترقی یافتہ ممالک کی عادت و اطوار اور طرز زندگی کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں اوراس نقالی کو جدت سے تعبیر کرتے ہیں ۔ بانو قدسیہ ''حسن خاتمہ'' افسانے میں لکھتی ہیں:

''سب سے پہلے لندن میں مستقل طور پر منتقل ہونے پر اسے اپنے لباس اور زبان پر ہی تو اعتراض ہوا تھا ۔ یہ کیا'دو ٹانگوں والی ستھن'چاکوں والی قمیض،اوپر سے دوپٹے کا بھی دم چھلا ۔ آدمی کتنا غیر مہذب لگتا ہے ایسے لباس میں----اوپر سے سلام علیکم سلام علیکم ۔ ۔ ۔ ۔ سلام علیکم کہتے تو کتنے اولڈ فیشنڈ لگتے ۔''(۳)

عصر حاضر کی نوجوان نسل عجیب بے چینی اور تذبذب کا شکار ہے ۔ وہ مغرب کی اندھی تقلید کرنا تو چاہتی ہے مگر اپنے مذہب کو چھوڑنا بھی نہیں چاہتی ۔ اپنے تفکرات کو حقیقت کی شکل دینا چاہتی ہے تو مذہب آڑے آتا ہے۔ کیوں کہ ہمارا مذہب اتنی آزادی نہیں دیتا جتنی مغربی سماج تقاضا کرتا ہے ۔ ترقی یافتہ اقوام نے مسلسل محنت او ر جدو جہد سے ترقی حاصل کی ہے ۔ وہ ابھی بھی تسخیر کائنات میں مصروف ہیں جب کہ ہماری نوجوان نسل ہاتھ پر ہاتھ دھرے ان کی برابری کرنا چاہتی ہے ۔ بغیر کچھ کیے ملک کی تقدیر بدلنا چاہتی ہے ۔ عصر حاضر کی نوجوان نسل کی عکاسی کرتے ہو ئے بانو قدسیہ لکھتی ہیں :

''ان لڑکے اور لڑکیوں میں ایک بات ضرور ملتی جلتی تھی ۔ وہ سب ہمتوں کی پستی اور شوق کی بلندی کا شکار تھے ۔ یہ اندر باہر کہیں پہنچنا ضرور چاہتے تھے لیکن ان میں نہ تو لگن تھی نہ ہی وہ مسلسل محنت کے عادی تھے ۔ کچھ دور تک تو وہ ہر خیال کے پیچھے بھاگتے لیکن پھر خوابوں کے خول میں چلے جاتے ۔ ۔ ۔ ۔ یہ نہ تو پورے مشرقی تھے نہ پورے مغربی ۔ مشرق کو چھوڑنے کا قریباً تہیہ کئے بیٹھے تھے لیکن مغرب میں دھنس جانے کا حوصلہ نہ رکھتے تھے ۔ ۔ ۔ اتنی ساری Scape gloatingکے بعد وہ ٹھنڈے میٹھے ہو کر پھر زندگی انجوائے کرنے کی دھن میں لگ جاتے۔''(۴)

ہمارے ملک کے کار ساز سیاستدان ہیں ۔ ملک کی لگام ان کے ہاتھ میں ہے ۔ اس لیے چاہیے تو یہ کہ ان سیاستدانوں کو اعلیٰ تعلیم یافتہ،ہر شعبے کے نشیب و فراز سے باخبر،دوسروں کے لیے نرم گوشہ رکھنے والے،ان کے مسائل کو اپنے مسائل سمجھ کر حل کرنے والے اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے کوشاں ہوں ۔ ان کی کوشش ہو کہ دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کریں اور ایسے قانون کے نفاذ کو ممکن بنائیں جو سب کے لیے ایک جیسا ہو ۔ ہمارے ملک میں بدقسمتی سے انسانیت کی خدمت سے عاری لوگ اپنے نام کا ڈنکا بجانے کے لیے اس میدان میں قدم رکھتے ہیں ۔ ان کے لیے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کی بھی قید نہیں ۔ اس میدان میں آنے والوں کے ماضی کوبھی بالائے طاق رکھا جاتا ہے ۔ اس لیے اکثرجرائم پیشہ لوگ طاقت اور دولت کے بل بوتے پر جیت کو اپنے نام کر لیتے ہیں ۔ اپنی جیت کی راہ میں حائل رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے انسانیت کشی سے بھی دریغ نہیں کرتے ۔ کم تعلیم یافتہ لوگ ملک کو سنوارنے کی بجائے بگاڑنے کا باعث بنتے ہیں ۔

ہمارے معاشرے میں دو لت کے بل بوتے پر ان پڑھ جاہل لوگ اعلیٰ سیاسی مسندوں پر فائز ہو تے ہیں جن میں نہ حالات و واقعات کو سمجھنے کی صلاحیت ہو تی ہے نہ الجھی گتھیوں کوسلجھانے کی قابلیت ۔ وہ صرف اپنی شان و شوکت میں اضافے اور دو سروں پر رعب و دبدبہ ڈالنے کی غرض سے اس میدان میں قدم رکھتے ہیں ۔ اس شعبے میں کامیابی کے لیے مقعر فہم و ادراک اور علمی بصیرت کا ہونا ضروری نہیں ،فقط رشوت اور سفارش سے کامیابی کا حصول ممکن ہوجا تا ہے ۔ اس میدان میں کا میابی کی کنجی دو لت ہے ۔ بانو قدسیہ نے ''مجرا ''افسانے میں اس حقیقت سے پردہ اٹھایاہے:

> ''کیا مشکل ہے جی ؟.....نگار تنک کر بولی.....مشکل یہ ہے کہ میں اپنا نام تک لکھنا نہیں جانتا اور.....اور..... نگار نے فلک بو س قہقہہ لگایا اور وزیر کے ساتھ لٹک کر بولی..... واہ جی !وہ جو اسمبلیوں میں بھرے ہو تے ہیں وہ پڑھے لکھے ہو تے ہیں ۔واہ میاں جی واہ آ پ نے تو وہی بات کی جس کے کندھے پر پنکھ نہ ہوں وہ فرشتہ نہیں ہو تا ۔ ''(۵)

بانو قدسیہ ایک اور سماجی حقیقت کی طرف ہماری توجہ دلاتی ہیں کہ ہمارے معاشرے میں ماں باپ ناخواندہ ہی کیوں نہ ہوں لیکن اپنے بچوں کوبہتر سہولیات اور جدید تعلیم سے آراستہ کرنا چاہتے ہیں ۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ان کے بچے تعلیم حاصل کر کے اچھی زندگی گزاریں ۔ لیکن جب بچے تعلیم حاصل کر کے اپنی منزل پر پہنچ جاتے ہیں تو وہی ماں باپ جنھوں نے اپنا پیٹ کاٹ کر انھیں اس مقام تک پہنچایا ہوتا ہے، ان بچوں کے سامنے خود کو کمتر محسوس کرتے ہیں اور اپنے بچوں کی بات کو حرف آخر سمجھتے ہیں ۔ کم تعلیم یافتہ گھرانوں میں اگر کوئی شخص اعلیٰ تعلیم حاصل کر لے تو اس کے والدین اپنی ہی اولاد سے خوف محسوس کرتے ہیں ۔ چاہے اولاد ان کی بہت عزت کرتی ہو ۔ خاص طور پر جب دیہات کے لوگ شہر میں حصول علم کے لیے جاتے ہیں تو ان کی زبان،لباس،خوراک اور رہن سہن میں بہت فرق آجاتا ہے ۔ جس کی وجہ سے والدین انھیں اپنے سے اعلیٰ وبرتر سمجھنے لگتے ہیں ۔ بانو قدسیہ اس پہلو کی عکاسی ''بڑابول''افسانے میں کرتی ہیں ۔ اس افسانے میں چوھدرائن کی بیٹی عصمت جب شہر سے تعلیم حاصل کر کے لو ٹتی ہے تو اس کی سوچ اور طرز زندگی میں واضح تبدیلی آجاتی ہے ۔ جس کی وجہ سے چوھدرائن، جس کا پورے گھر میں رعب و دبدبہ تھا،اپنی بیٹی عصمت سے دبتی ہے ۔ بانو قدسیہ تعلیم یافتہ لڑکیوں کے سامنے ان پڑھ ماں کی کیفیت بیان کرتے ہو ئے لکھتی ہیں:

> ''چوہدرائن سب کو ڈانٹ ڈپٹ لیتی ۔ ۔ ۔ لیکن عصمت کے سامنے چو ہدرائن ایسے پھرتی جیسے ڈبو کتا ٹانگوں کے اندر دم دبائے پھرتاہے۔ ''(۶)

اللہ تعالیٰ نے مردو عورت کی جسمانی ساخت ایک دوسرے سے مختلف بنائی اور اس کے مطابق ہی اسے ذمہ داری تفویض کی۔ عورت کے تحفظ کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے گھر یلو امور کی ذمہ داری سونپی اور مرد کو کفالت کی ۔ حقوق دونوں کے برابر ہیں فرائض مختلف ۔ لیکن ہمارے ہاں عورت نے قومی اور مذہبی اصول و قوانین کو بالائے طاق رکھ کر حقوق کے ساتھ ساتھ فرائض کی برابری کی

بھی بات کی ۔ مغرب کی تقلید میں نتائج کے اعتبا ر سے تباہ کن آزادی کا علم بلند کیا ۔ اس بات کو مزید ہوا دینے کے لیے ہر سال عورتوں کی آزادی کا عالمی دن منایا جاتا ہے ۔ جس میں عورتیں حقوق کی کم اور مرد سے آزادی حاصل کرنے کی زیادہ بات کرتی ہیں ۔ وہ مرد کی بجائے اپنی کفالت خود کرنے کو تر جیح دیتی ہیں ۔ جب کچھ خواتین کسی نہ کسی پیشے سے وابستہ ہوجاتی ہیں ۔ وہ زندگی اپنی مرضی سے گزارنا چاہتی ہیں ۔ زیادہ تر خواتین خود کو مرد کے احکامات اور پابندیوں کے جال میں جکڑتیں اور نہ ہی بچوں کو اپنا دم چھلا بناتی ہیں ۔

ہمارے سماج میں لڑکیاں تعلیم حاصل کر کے جب اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جا تی ہیں کہ بغیر کسی کی مالی امداد کے اپنی ضروریات زندگی پوری کر سکیں تو شادی جیسے مقدس بندھن میں بندھنے سے گریز کرتی ہیں ۔ وہ زندگی گزارنے کے لیے دو لت کو کافی سمجھتی ہیں ۔ رفتہ رفتہ وہ اپنی ذات کے کیپسول میں بند ہو کر اپنے اور لو گوں کے درمیان آ ہنی دیوار قائم کر لیتی ہیں ۔ اس کی طرف نشاندہی کرتے ہو ئے بانو قد سیہ نے اپنے افسانہ ''دو رنگی '' میں لکھا ہے کہ''در اصل جس شیر کے منہ کو آدمی کا لہو لگ جا ئے وہ آدم خور ہو جا تا ہے اور جس عورت کے منہ کو Careerلگ جا ئے وہ آدم بیزار ہو جا تی ہے ۔ ''(۷)

والدین پر مذہب اور معاشرے کی طرف سے ایک اہم ذمہ داری بچوں کی صحیح نہج پر تعلیم و تربیت ہے ۔ اگر آج ہم ان کی مثبت بنیادوں پر تربیت کریں گے تووہ ملک کو ترقی اور مرفہ الحالی کی طرف لے جائیں گے ۔ لیکن اگر ان کی اچھی تربیت کرنے میں ناکام رہے تو شکست و ریخت ملک و معاشرے کا مقدر ہو گا ۔ اگر ہم ماضی میں چند برس پیچھے دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ زیادہ تر بچوں کی ابتدائی تربیت ان کی دادی یا نانی کرتیں ۔ وہ ذمہ داری سے مشرقی قدروں کا اثاثہ بچوں تک منتقل کرنے کی کوشش کرتیں ۔ بچپن کی یہ سنی ہو ئی باتیں ان کی فطرت ثانیہ بن جاتیں جو اکثر انھیں بے راہ روی سے بچاتیں ۔ مرورایام کے ساتھ صنعتی اور آئی ٹی کی ترقی نے دنیا میں تہلکہ مچادیا ۔ جس نے زندگی میں آسانیوں کے ساتھ بہت سے مسائل کو بھی جنم دیا اور بچوں کی تعلیم و تربیت پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے ۔ پہلے بچوں کو سلانے اور روتے میں بہلانے کے لیے انھیں لوری سنائی جاتی اور نبیوں کے قصے اور طوطا مینا کی اخلاقی اور سبق آموز کہانیوں سے ان کا دل بہلایا جاتا تھا ۔ لیکن اب ایک سال کا بچہ بھی ایسی صورت میں موبائل فون کی طلب ظاہر کرے گا ۔ جسے عصر حاضر کے والدین بخوشی پوری کرتے ہیں ۔ بچوں کے ابتدائی سال جو ان کی تربیت کے لحاظ سے بہت اہم ہیں وہ کارٹون اور وڈیو گیمز کھیلنے میں گزرتے ہیں ۔ اس کے علاوہ ماں باپ ان کی وقت بے وقت فرمائشیں پوری کرتے ہیں تا کہ ان کی خود اعتمادی میں اضافہ ہواوروہ احساس برتری کی بدولت اپنی ہر بات منوا سکیں ۔ اس لیے وہ عاجزی و انکسار ی کی بجائے ان میں احساس تفاخر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ بانو قدسیہ چوں کہ مشرقی اقدار کی پرورده تھیں ۔ وہ انھی اقدار کو معاشرے میں پنپتے دیکھنا چاہتی تھیں لیکن معاشرے میں ان کی سوچ اور فکر کے برعکس اقدار فروغ پا رہی تھیں ۔ جنھیں دیکھ کر انھیں شدید ملال ہوتا تھا ۔ وہ ''مراۃ العروس'' افسانے میں موجودہ صورتحال کی عکاسی کرتی ہیں ۔ اس میں زاہد اپنی بیوی سے بچوں کے متعلق کہتا ہے:

> ''بچوں کو دباؤ گی تو یہ پھر سوسائٹی میں آگے بڑھنے کے قابل نہیں ہوں گے ۔ ۔ ۔ ان کو دوسروں کو دبانا جھڑکنا آنا چاہیے ۔ یہ اس دور کی اہم ضرورت ہے خاص کر تھرڈ ورلڈ کی ۔ ۔ ۔ بہت جلد یہ تینوں challengesقبول کرنے والے بڑے شاندار ہیومین بینگزبن جائیں گے---- قدآور----اپنی اہمیت کے احساس سے تنے ہوئے ۔ ''(۸)

ہمارے معاشرے میں اصول و قوانین غریب طبقے کے لیے ہو تے ہیں ۔ امیر طبقہ اکثران پر عمل در آمد کو ضروری خیال نہیں کرتا اور نہ ہی عام طور پر اصول و قوانین امیر طبقے کے مقاصد کے حصول میں کسی قسم کی رکاوٹ کا مو جب بنتے ہیں ۔ کیوں کہ دو لت کی بنا پر ان قدغنوں کو پاٹنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے ۔ اسی عدم مساوات کی وجہ سے غریب و نادار اور بے بس لوگ اس معاشرے

میں انصاف حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں ۔ کیوں کہ انصاف حاصل کرنے کے لیے غریبوں کے پاس مطلوبہ رقم یا سفارش نہیں ہو تی ۔ مجبوراً انھیں حالات کے ساتھ سمجھوتا کر نا پڑتا ہے ۔ با نو قدسیہ کے افسانہ ''سمجھوتہ ''کی تیجو مفلسی کی بنا پر اپنے بیٹے کے قتل کا بدلہ نہ لے سکی کیو ں کہ : ''تیجو کو علم نہ تھا کہ قانون اور انصاف دو علیحدہ چیزیں ہیں ایک دوسرے تک کو ئی ایسا پل آج تک تعمیر نہیں ہوا جس پر ہر طبقے کا آدمی چل کر اپنی منزل پالے ۔ ''(۹)

بانو قدسیہ نے اپنے معاشرے کا غیر جانبداری سے جائزہ لیا ۔ انھوں نے سماج کو مثبت بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے اس میں موجود برائیوں کو نمایاں کیا تاکہ لوگ آگاہ ہو کر انھیں ختم کرنے کی کوشش کریں ۔ بانو قدسیہ نے اپنے افسانوں میں رشوت جیسی سماجی شناعت پر بھی روشنی ڈالی ۔ ہمارے معاشرے میں رشوت کا چلن عام ہے جو غریبوں کے حق حاصل کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے ۔ کیوں کہ امیر لوگ اپنے ناجائز مقاصد کے حصول کے لیے دولت کو بطور آلہ کار استعمال کرتے ہیں ۔ پاکستان کے تقریبا ہر شعبے میں رشوت جیسی برائی موجود ہے ۔ دولت کو دیکھ کر کچھ اعلیٰ حکام کے ضمیر کی آواز دب جاتی ہے ۔ وہ چند روپوں کے عوض حق داروں کو ان کے حق سے محروم کر دیتے ہیں ۔

رشوت اور سفارش کی وجہ سے لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود اپنا حق حاصل کرنے میں نا کام رہتے ہیں اور اونچی آسامی کے لوگ قابلیت کی جگہ دو لت استعمال کر کے اہل ٹھہرتے ہیں ۔ اس معاشرے میں رشوت اور سفارش کو ایک آلہ کار کے طور پر استعمال کیا جا تا ہے ۔ یہ وہ کنجیاں ہیں جن سے قریبا تمام قفل کھل جا تے ہیں ۔ بانو قدسیہ اس حقیقت کی ترجمانی کرتے ہو ئے لکھتی ہیں : ''تیسری دنیا میں صرف دو لت کام آ تی ہے ۔ جہاں نہ میرٹ راستہ کھولتا ہے نہ شرافت نجابت..... بس ہتھیلی گرم کرنے سے کھل جا سم سم کا اثر ہو تا ہے ۔ ''(۱۰)

با نو قدسیہ نے اپنی کہانیوں کا مواد معاشرے سے حاصل کیا ۔ ان کی کہانیاں اپنی یا اپنے ارد گرد پھیلے ہو ئے لو گوں کی کہانیاں معلوم ہو تی ہیں ۔ وہ کہانی لکھتے وقت جھوٹی ملمع کاری سے گریز کرتیں ۔ انھوں نے جوکچھ آنکھوں سے دیکھا، محسوس کیا اسے تحریروں کے ذریعے قاری کے گوش گزار کر دیا ۔ ڈاکٹر انور سدید رقمطراز ہیں:

> ''بانو قدسیہ کے افسانے پاکستان کی معاشرتی زندگی اور متوسط طبقے میں فروغ پانے والے جذبات و احساسات کے افسانے ہیں ۔ ۔ ۔ بانو قدسیہ کا افسانہ زندگی کی زمینی حقیقت سے جنم لیتا ہے اور معاشرتی آگہی کا آئینہ دار بن جا تا ہے ۔ ''(۱۱)

بانو قدسیہ نے اپنے افسانوں میں معاشرے کا کلی طور پر احاطہ کرنے کی سعی کی اور ان عوامل و عناصر کو آشکار کیاجو گھر اور معاشرے کی سا لمیت کے لیے خطرہ ثابت ہوتے ہیں ۔ بانو قدسیہ طبیعتاً امن پسنداورصلح جو تھیں اس لیے وہ اپنے افسانوں میں نفرت،بے انصافی،بغاوت اور انتقامی جذبے وغیرہ کی شدید مذمت کرتی ہیں تاکہ معاشرے کا شیرازہ بکھرنے نہ پائے ۔

ہمارے معاشرے میں عام طور پر ہر گھر میں لڑائیاں جھگڑے ہوتے رہتے ہیں لیکن خوشی اور غم کے موقع پر سب لوگ رنجشیں بھلا کر پھر سے مل بیٹھتے ہیں ۔ حالات اس وقت سنجیدہ صورتحال اختیار کرتے ہیں جب کوئی تیسرا یعنی گھر سے باہر کا فرد گھر کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی شروع کرتا ہے ۔ اورآپ اپنوں کی بجائے اس تیسرے فرد کو اپنا ہمدرد سمجھنے لگتے ہیں ۔ وہی فرد ہمدردی اورپیارو محبت کی آڑ میں آپ کے گھر کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیتا ہے ۔ وہ خود کو آپ کا خیر خواہ،گھر والوں کو ظالم اور آپ کو مظلوم کے طورپر ظاہر کرتا ہے ۔ جس سے آپ کی قربت اس سے مزید بڑھ جاتی ہے ۔ اس کے احساس دلانے پر آپ اپنوں کو ظالم سمجھ کر ان سے دوری اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اپنا دکھ سکھ گھر والوں سے بانٹنے کی بجائے اس سے بانٹتے ہیں ۔ جس سے اس کا مزید حوصلہ بڑھتا ہے ۔ اس با ت کی عکاسی بانو قدسیہ یوں کرتی ہیں:

> ''گھر کی بنیاد ہلانے والے گھر کے فرد نہیں ہوتے ۔ گھر کے سارے افراد ازل سے لڑتے

جھگڑتے آئے ہیں لیکن وہ جدا نہیں ہوتے ۔ لیکن جب کوئی باہر کا چاہنے والا سیندھ لگا کر آجاتا ہے تو پھر گھر کے پر خچے اڑ جاتے ہیں ۔ ''(۱۲)

اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل و شعور عطا کیا ۔ جس کی بنا پر وہ کھرے اور کھوٹے میں تمیز کر سکتا ہے ۔ اپنی ذات کا محاسبہ کر کے شخصیت کو بہتر بنا سکتا ہے ۔ لیکن کچھ چیزوں مثلا رنگ و نسل اور شکل و صورت پر کچھ اختیا ر نہیں ۔ ہم لوگ یہ جانتے ہوئے بھی کہ کائنات کی سب سے خوبصورت تخلیق انسان ہے،اس کے باوجود کچھ لوگوں کو خوبصورت قرار دیتے ہیں اور کچھ کو بد صورت ۔ ہم نے خوبصورتی و بد صورتی کے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں جن کو ملحوظ رکھ کر دوسرے کے خوبصورت یا بد صورت ہونے کا فیصلہ کیا جاتا ہے ۔ ہمارے ہاں جلد کی سفیدی اور تیکھے نقوش کو پسند کیا جاتا ہے جب کہ بھدے نقوش اور سیاہ رنگت کو ناپسند کیا جاتا ہے ۔ کچھ لوگوں کو دوسروں کی سیا ہ رنگت دیکھ کر ہی گھن آتی ہے ۔ ہم لوگ خطبہ حجۃ الودع کو ماننے کے باوجود رنگ و نسل کے امتیاز پر یقین رکھتے اور گورے رنگ کو کالے رنگ پر فو قیت دیتے ہیں ۔ دوسروں کی رنگت دیکھ کر اندازہ لگاتے ہیں کہ اس کا تعلق طبقہ اشراف سے ہے یا رذیل طبقہ سے ۔ بانو قدسیہ نے'' کال کلیچی'' اور '' کلو '' میں اس حقیقت کو بیان کیا ۔ ''کلو ''افسانہ میں کلثوم کو سب اس کے رنگ کی مناسبت سے کلو کہتے ہیں :

''دیکھو ساجد بھائی !ہم سب انگریز ہیں اور یہ کالا آدمی-----
کون کالا آدمی---اور کون؟کلو نے خونی آنکھیں نکال کر پوچھا تھا ۔ ''(۱۳)

ہمارے سماج میں افراد کی عزت ان کی ذات کی اچھائی یا صلاحیتوں کی بنا پر نہیں بلکہ اعلیٰ خاندانی پس منظر کی بدولت کی جاتی ہے ۔ اگر کو ئی فرد امیر خاندان سے تعلق رکھتا ہے تو ہم اس کی عزت کرتے ہیں ۔ اس کے بر عکس اعلیٰ اقدار کا حامل شخص اگر نچلے طبقے سے تعلق رکھتا ہو تو اس کے خاندانی پس منظر کی بنا پر اس کی تمام خوبیوں کو نظر انداز کر دیا جا تا ہے ۔ اس لیے ہم جب کسی سے ملتے ہیں تو اس کی ذات میں دلچسپی لینے کی بجائے اس کے خاندان کو جاننے کی کو شش کرتے ہیں ۔ کیو ں کہ ہمارے معاشرے میں فرد کی پہچان اس کے خاندان سے ہے ۔ اس کے علاوہ کوئی بھی فرد جتنی مغربی سماج سے مشابہت رکھے گا اتنا ہی اسے باعزت سمجھا جائے گا ۔ اس حقیقت کو عیاں کرتے ہو ئے بانو قدسیہ لکھتی ہیں:

''ہمارے پاس اب صرف چار قسم کی پہچان ہونی چاہیے ۔ کوئی شخص امیر ہو-----مغربی تعلیم سے آراستہ ہو-----گورے رنگ کے ساتھ خوبصورت ہو-----اونچی ذات کا خاندانی ہو-----بھائی اسے کوئی وی آئی پی بننے سے روک نہیں سکتا-----''(۱۴)

بانو قدسیہ نے اپنے افسانوں میں طبقاتی تضاد کو غیر جانبداری سے پیش کیا ۔ چوھدری اور وڈیرے قسم کے لوگوں پر بھی روشنی ڈالی کہ ملازموں کا ہجوم ہر وقت ان کی خدمت کے لیے کوشاں ہتا ہے ۔ ایسے لوگ ملازموں کے ہاتھ کا پکا کھانا توکھاتے ہیں لیکن انھی کے ساتھ بیٹھ کر کھانا پسند نہیں کرتے ۔ انھی کو یہ صاف ستھرے نہیں سمجھتے جو ان کے گھروں کو صاف رکھتے ہیں ۔ جب کہ غریب ملازم بلا چون و چرا ان کی خدمت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ ان کے گھروں میں چولہے انھی چوھدریوں کے دیے سے گرم ہوتے ہیں ۔ یہی بات چوھدریوں میں تکبر کا بیج بو دیتی ہے ۔ وہ سمجھتے ہیں کہ عزت و دولت ان کا پیدائشی حق ہے ۔ جس کا ان کے ماتحتوں سے کوئی تعلق نہیں ۔ اسی لیے چو ھدری اور وڈیرے خود کو کمی کمینوں سے الگ اور برترمخلوق سمجھتے ہیں ۔ بانو قدسیہ افسانہ ''بڑا بول'' میں امرا و غربا میں تفاوت کو مو ضوع بناتیں اور متکبر چو ھدرائن کا نقشہ یوں کھینچتی ہیں :

''اسے یہ ضرور علم تھا کہ غریبوں کی زندگی مشکل گزرتی ہے ۔ لیکن اس ذلت آمیز زندگی میں وہ اپنے آپ کو عزت دار بھی سمجھتے ہیں ۔ اس کا اسے علم نہ تھا! بھلا جو پلا ہی دلدر میں ہو اس کا عزت نفس سے کیا تعلق؟''(۱۵)

بانو قدسیہ کے افسانو ں کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں کا خام مواد معاشرے

سے حاصل کرتیں اور اسے فنی چاشنی کے ساتھ افسانے کی شکل میں ڈھال دیتیں ۔ اس طرح قاری کی دلچسپی کہانی میں مزید بڑھ جاتی ہے ۔ بانو قدسیہ نے اپنے افسانوں میں کسی ایک طبقے کو بے نقاب نہیں کیا بلکہ ہر طبقے کے لوگوں کی زندگیوں کو جزئیات کے ساتھ بیان کیا ۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں جھوٹی ملمع قاری سے گریز کیا بلکہ جو کچھ معاشرے میں دیکھا ،محسوس کیا، اسے افسانے کی صورت قاری کے سامنے گوش گزار کر دیاتا کہ لوگ معاشرتی حقائق سے آگا ہ ہو کر معاشرے میں پھیلی بد امنی کو ختم کرنے اور اس میں بہتری لانے کی کوشش کریں ۔

بانو قدسیہ نے اپنے افسانوں میں عصر حاضر کے معاشرتی نشیب و فراز کی کمال فن سے عکاسی کی ۔ انھوں نے معاشرے کے صرف منفی پہلوؤں کو ہی اجاگر نہیں کیا بلکہ سماج کی مثبت قدروں کو بھی نمایا ں کیا ہے تا کہ لوگ معاشرے سے بد ظن نہ ہوں ۔ بانو کو ہر طبقہ کے لوگوں سے دلچسپی تھی اس لیے ان کے افسانوں میں ہر طبقے کی جھلک نظر آتی ہے ۔ انھوں نے ہر طبقے کی زندگی کا بنظر غائر مشاہدہ کیا اور دلکش پیرائے میں بیان کیا ۔

مجموعی طور پر دیکھا جا ئے تو ان کے افسانوں پر حقیقت کی چاشنی نمایاں ہے ۔ جو کچھ انھوں نے اپنے گردو پیش میں دیکھا، محسوس کیا اسے فنی مہارت سے اپنے افسانوں میں پیش کر دیا ۔ اس لیے بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کے افسانے عصری آگہی کا بہترین نمونہ ہیں ۔

حوالہ جات

۱۔ شمیم روشن آرا، ڈاکٹر، بانو کے افسانے۔۔ حقیقت کے افسانے، مشمولہ ؛**زبان و ادب،** شمارہ۱۱، دسمبر ۲۰۱۲ء، ص۱۳
۲۔ بانو قدسیہ ،**سامان و جود** ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ،۲۰۱۳ء،ص۱۸۶
۳۔ بانو قدسیہ ،**آتش زیر پا،** لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۳ء،ص۱۶۵
۴۔ بانو قدسیہ ، **دو سرا دروازہ** ،لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز ،۲۰۱۵ء،ص ۲۷۔۴۷
۵۔ بانو قدسیہ ، **دست بستہ** ، لاہور : سنگ میل پبلی کیشنز ، ۲۰۱۵ء،ص۹ ۔۱۷
۶۔ بانو قدسیہ ، **نا قابل ذکر** ، لاہور : سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۳ء،ص۱۱۹
۷۔ ایضا،ص۲۳
۸۔ بانو قدسیہ ، **دو سرا دروازہ** ،ص۳۳۔۳۵
۹۔ بانو قدسیہ ، **توجہ کی طالب**،ص۱۵۵
۱۰۔ بانو قدسیہ ، **دست بستہ**،ص۱۴۸
۱۱۔ انور سدید ، ڈاکٹر ، **بانو قدسیہ شخصیت اور فن** ، اسلام آباد: اکادمی ادبیات ،۲۰۰۸ء،ص ۵۸
۱۲۔ بانو قدسیہ ، **توجہ کی طالب**،ص۱۷۵
۱۳۔ ایضا،ص۵۸۸
۱۴۔ بانو قدسیہ ، **ہجرتوں کے درمیان** ، لاہور : سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء،ص ۱۸
۱۵۔ بانو قدسیہ ، **نا قابل ذکر** ،ص ۱۳۴